جدید غزل میں اقدار کا کرائسس

کلیدی الفاظ: رجحانات#اقدار#شکست وریخت#مسائل موضوعات

عرفان علی بشر

رِسرچ اسکالر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

تلخیص: کہا جاتا ہے کہ اچھا ادب عام طور پر مشکلات ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں تقسیم ملک ، صنعتی اِنقلاب کی نِت نئی ایجادات اورٹیکنالوجی کی قیامت خیز ہنگاموں کے باعث سب سے بڑی ضرب زندگی کی قدروں پر پڑی جس نے نوعِ انسانی سے نہ صرف اس کا ماضی چھین کر تمام اقدار بے معنی کر دئے بلکہ خدا کو بھی اس کی نظروں میں مشکوک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی ، اس کے راستے اتنے پیچیدہ، پرخطر اور ناہموار ہو گئے کہ وہ مادی وروحانی الجھنوں کے جنگلوں میں دنیا اور تمام رشتوں ناطوں سے مایوس ہو کر بھٹکنے لگا۔ یہی وجہ ہے اس عہد میں جو احتجاجی وانقلابی شاعری ہوئی وہ اپنے اندر بے حد گہرائی اور معنویت رکھتی ہے۔ اسے ترقی پسند شاعری کا نام دے لیں یا عبوری شاعری کا ،لیکن اس ماحول میں اردو غزل کا بہترین سرمایہ تخلیق ہوا۔ جدید غزل کے اساسی عناصر میں در بدری، ہجرت، بے مکانی، زندگی کا کرب، بے معنویت،، فرد کی مجروح تمنّا، نفسیاتی الجھنوں، خوابوں کی شکستگی اور محرومی، تنہائی و اداری ،افراتفری، اداسی، گھبراہٹ اور حساس مرگ جیسے احساسات کو اس دور کی غزلوں میں مرکزی جگہ ملی۔

کہا جاتا ہے کہ اچھا ادب عام طور پر مشکلات ہی میں پیدا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی میں تقسیم ملک ، صنعتی اِنقلاب کی نِت نئی ایجادات اورٹیکنالوجی کی

قیامت خیز ہنگاموں کے باعث سب سے بڑی ضرب زندگی کی قدروں پر پڑی جس نے نوعِ انسانی سے نہ صرف اس کا ماضی چھین کر تمام اقدار بے معنی کر دئے بلکہ خدا کو بھی اس کی نظروں میں مشکوک کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی، اس کے راستے اتنے پیچیدہ، پرخطر اور ناہموار ہو گئے کہ وہ مادی و روحانی الجھنوں کے جنگلوں میں دنیا اور تمام رشتوں ناطوں سے مایوس ہو کر بھٹکنے لگا۔ یہی وجہ ہے اس عہد میں جو احتجاجی و انقلابی شاعری ہوئی وہ اپنے اندر بے حد گہرائی اور معنویت رکھتی ہے۔ اسے ترقی پسند شاعری کا نام دے لیں یا عبوری شاعری کا، لیکن اس ماحول میں اردو غزل کا بہترین سرمایہ تخلیق ہوا۔ جدید غزل کے اساسی عناصر میں در بدری، ہجرت، بے مکانی، زندگی کا کرب، بے معنویت ،، فرد کی مجروح تمنّا، نفسیاتی الجھنوں، خوابوں کی شکستگی اور محرومی، تنہائی و اداری ،افراتفری ، اداسی ، گھبراہٹ اور حساس مرگ جیسے احساسات کو اس دور کی غزلوں میں مرکزی جگہ ملی۔

تواریخ اور تہذیبوں کے ارتقاء اور زوال کی روداد بتاتی ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کی صورت ہمیشہ موجود رہتی ہے اور ادب ہمیشہ اسی ٹوٹ پھوٹ کے زیر اثر میں پرورش پاتا ہے۔ یہ محض بیسویں صدی کی ہی خصوصیت نہیں بلکہ دقیانوسی روایات کے خلاف نئی فکر کا یہ چیلنج ہمیشہ رہا ہے۔ لیکن اس دور میں مشینی زندگی، نیچر سے انسان کی ازلی وابستگی کے خاتمے، خدا کے تصور کے زوال اور کمیت کے طور پر ظلم و تشدد، نا انصافی ریاست کے آمرانہ مطالبے ،سماجی تنگ نظری، فرسودہ رسومات و توہمات، مذہبی تعصب اور بربریت، مجرمانہ غیر انسانی افعال قوت اور اقتدار کی جنگ استحصال اور جنسی ساویت پرستی وغیر میں اس قدر اضافہ ہوگیا ہے جو کسی دور میں موجود نہیں تھی ۔ اس شکست و ریخت نے انسان کو اس کی تمام تر تہذیب کے ساتھ پامال کر دیا ہے۔ اس ضمن میں علی احمد فاطمی اپنے مضمون ''نئی تنقید اور نئے اقدار'' لکھتے ہیں:

> ''۔۔۔صورتوں اور بدحالیوں سے سماج کی جو اوپر اوپر کی جو یہ فضا
> بن رہی ہے اس نے سماجی ماحول، اصول وضوابط -نظم وضبط سب

کچھ الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ خیر پر شر، حق پر باطل کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ دھوکہ فریب آج کی زندگی کا اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔ سچائی، سادگی، ایمانداری، حقیقت پسندی سب دم توڑ رہی ہیں۔ اس پر اقتصادی بدحالی۔ اخلاقی پامالی۔ مستقبل کی فکر مندی۔ قتل و غارت گری، علیحدگی پسندی اور دیگر سماجی، اتھل پتھل مثلاً صنعتی ریل پیل، نئی طبقاتی کشمکش یا طبقوں کی نئی تقسیم اس پر پورے سماج کا کمرشلائزیشن۔ ان سب نے مل کر نئے سماج کی جو تصویر ابھاری ہے وہ بڑی ہی عجیب وغریب ہے جس میں بس یہ تو صاف ہے کہ صحت مند اور صالح قدروں کا زوال ہو چکا ہے۔ انسانی قدروں کی پامالی اس دور کا مقدر بن چکی ہے باقی سب دھندلا دھندلا ہے اس واضح اور غیر واضح سماج کی ملی جلی تصویروں کا عکس اردو کی نئی غزل میں صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔''[۱]

مذکورہ سطور اور اقتباس کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس صدی میں حالات جس تیزی سے تبدیل ہو کر جس ہمہ گیر طور پر اثر انداز ہوئے ہیں ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اس لئے آج ایک مستقل انتشار کی صورت پیدا ہو گئی ہے جو ایک متضاد اصطلاح ہے۔ یہ کافی حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ تشویش اور کشمکش مستقل اجزاء ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ آج نصب انہیں میں انتشار ہے۔ اس انتشار کی سب سے نمایاں صورت ہے سماج اور فرد کی کشمکش جو کہ جدید دور میں ایسے نہج پر پہنچ گئی ہے جسے ذات کے تراس کا نام دیا ہے۔ یہی وجہ ہے جدید شاعری میں ذات کی گم شدگی اور تلاش اہم موضوع بن گیا ہے۔ تنہائی اور اجنبی پن کا فلسفہ بھی اسی سماجی انتشار اور شہری زندگی کی افراتفری اور گہما گہمی سے پیدا ہوا ہے۔ یہ کشمکش یا تو ازحیت کی صورت میں رونما ہو سکتی ہے یا آمریت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ یہ دونوں انجام ذہین لوگوں کو قبول نہیں۔ اگر دانشوروں کے سامنے انتخاب کا سوال ہو تو وہ پہلی

صورت کو ہی ترجیح دیں گے۔اس لئے آج کا ادب زیادہ تر مزاج کی صورتِ حالی کی آئینہ داری کرتا ہے اور خود ادب میں کبھی نراجی کیفیت نظر آتی ہے جس کے خلاف نئی فکر کے شعرا اور دانشور ہر دور میں نبرد آزما رہے ہیں۔

جدید غزل درحقیقت اسی نئے انسان کی خارجی اور داخلی شکست وریخت کا اظہار ہے۔اسے سامنے رکھ کر جدید غزل کا مطالعہ خاصا پیچیدہ عمل ہے۔کیونکہ ایک طرف زندگی میں بے تعلقی، بے کرداری اور بے حسی کی ملی جلی کیفیتیں ہیں تو دوسری طرف ٹیکنو کریسی کے مزاج سے آئی ہوئی برق رفتاری کی زندگی۔قدروں کی ان شکست وریخت سے جس شاعری نے جنم لیا وہ سنگین، شکستہ، بکھری ہوئی ایک سرچشمہ تھی۔کرب، زندگی کی تلخیاں، ناامیدی، ٹوٹتی بکھرتی قدریں جدید غزل میں ایک نئی شکل میں منظر عام پر آئی، جدید غزل کا اسی کا پیکر ہے۔اپنی ذات، اپنے وجود، فنا اور بقا کے سوالوں میں گھری ہوئی فطری، منطقی اور فلسفیانہ انداز میں بکھری بکھری اس عہد کی غزل انسانی زندگی کو منطقی طور پر اپنے اندرون میں لے کر ڈوب جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل میں بے حد گہرائی اور معنویت رکھتی ہے۔ ہندو پاک کے شعراء میں ظفر اقبال، پروین شاکر، عادل منصوری، منچندا بانی، بشیر بدر، عتیق اللہ، کمار پاشی، احمد مشتاق، احمد فراز، مظہر امام، زیب غوری، ندا فاضلی، احمد ندیم قاسمی، افتخار عارف، باقر مہندی، منیر نیازی، مجید احمد، قتیل شفائی، محمد علوی، ساقی فاروقی وغیرہ وہ شاعر ہیں جنہوں نے اپنی تازہ حسیت اور بے پناہ صلاحیت سے ان سبھی عصری موضوعا ت و میلانات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا جو نئے عہد کی پہچان ہیں۔

جدید غزل وہ واحد صنف سخن ہے جو نئے عہد کی تبدیلیوں کو اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہے۔جدید حسیت جدید آدمی کا کردار پوری طرح اپنا بنا کر پیش کرتی ہے۔اس عہد کی غزل نے جدید آدمی کے جن موضوعات کو سمیٹ لیا ہے ان موضوعات میں احساسِ تنہائی، ناامیدی، بے چینی، خوف پریشانی، بے سمتی، انتشار،

عدمیت، بے معنویت، جلا وطنی، بے جڑی، بے گانگی، جرم، برہمی، بیزاری، اکتا ہٹ، بوریت، اکیلا پن، اوب، بے بسی، بے رحمی، نا مرادی، ترسیل کا المیہ ،لافردیت، دیوانگی، جبریت، اس قدر حاوی ہے کہ آج کا آدمی ہراساں اور حیرت زدہ ہے۔ڈاکٹر سلیم زبیری جدید غزل کی جو پہچان بتائی وہ یہ ہیں:

''ذات کا کرب، تنہائی، زندگی کی شکست وریخت، اخلاقی قدروں کا زوال، مشینی دور میں انسانیت کا فقدان، خودغرضی، احساس غیر محفوظیت۔ مذہبی منافرت، انتشار، خوف و ہراس، بے چہرگی، ذات کی نا آسودگی، گھٹن، بے یقینی، دردوکرب، بے گھری، غریب الوطنی، جڑوں سے کٹنے کا غم، بے سروسامانی، سیاسی مکاریاں سماجی اور معاشی مسائل سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں انسانی رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، انسان کی بے حرمتی اور مذہبی عقیدوں کا کھوکھلا پن، دوستوں کی بے مروتی اور اپنوں کی بے اعتنائی جیسے جذبات ہیں۔''[۲]

جدید دور کا انسان ٹوٹتے بکھرتے رشتوں سے ذہنی اور روحانی سطح پر شدید کرب کا شکار ہے اور اپنے وجود کو دنیا کی بھیڑ میں پانے کی کوشش میں غیر یقینی صورت حال سے دو چار ہے۔آج کے انسان نے مادی اور سائنسی میدان میں حیرت انگیز کامیابی اور ترقی تو حاصل کرلی ہے لیکن اس ترقی اور کامیابی کا نتیجہ انسانیت کے زوال اور روحانی بے چینی کی صورت میں انسان کا مقدر بن گیا ہے۔ جہاں ایک طرف سائنس کی نئی نئی ایجادات نے اپنی برکات وثمرات سے انسان کو فیضیاب کیا اور تمام دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کردیا ہے وہیں انسان اس چھوٹے سے گاؤں میں خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا۔ مادی لحاظ سے تو انسان تمام دنیا سے جڑ گیا لیکن روحانی اور جذباتی سطح پر وہ خود سے اور دنیا سے کٹ گیا ہے اور اس کی ذات میں ناختم ہونے والی تنہائی کا کرب سما گیا ہے۔ نیا انسان

جس کرب سے گزر رہا ہے اس کی جھلک آج کے شاعر کے ہاں صاف نظر آتا ہے۔ جدید غزل گو شعراء نے انسان کے اردگرد پھیلی تنہائی کے اذیت ناک کرب کا اظہار بھرپور طریقے سے کیا ہے:۔اس نوعیت چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گزر کیوں نہیں جاتا
(ندا فاضلی)

دن کے ہنگامے جلا دیتے ہیں مجھ کو ورنہ
صبح سے پہلے کئی مرتبہ مر جاتا ہوں
(عتیق اللہ)

چاہتا ہوں میں منیؔر اس عمر کے انجام پر
ایک ایسی زندگی اس طرح مشکل نا ہو
(منیر نیازی)

جانے کس کو ڈھونڈنے داخل ہوا ہے جسم میں
ہڈیوں میں راستہ کرتا ہوا پھیلا بخار
(عادل منصوری)

اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جرأت پرواز بھلا کیا کرتا
(محسن احسان)

گھنے جنگلوں میں گم رستہ ہوا
بھری محفل میں تنہاں ہو گئے ہیں
(احمد فراز)

اڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور
اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

(منچندا بانی)

مذکورہ اشعات جدید دور کی زندگی پر سو فیصد صادق اترتا ہے۔جس قدر آج کا انسان تنہائی کا مارا ہوا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں تھا۔اپنے اردگرد کے ماحول سے بھی اس قدر دہشت زدہ ہے کہ جب وہ تھکا کا ہارا شام کو اپنے گھر لوٹتا ہے تو اُسے نہ وہ گھر اپنا لگتا ہے اور نہ گھر میں رہنے والے لوگ ہی اسے اپنے دکھائی دیتے ہیں وہ ایک عجب سا خوف اور سناٹا محسوس کرتا ہے۔اپنے گھر میں بھی غیر محفوظیت اور اپنے ہی گھر میں اجنبی ہونے کا احساس جدید انسان کا مقدر ہے وہ اپنے ہی گھر میں اس قدر سہما ہوا ہے کہ اُسے اپنا گھر آسیب کا گھر لگتا ہے۔زمینی اور خونی رشتے بھی اسے نا پائیدار اور بے معنی نظر آتے ہیں گھر کے تمام لوگوں کے اپنے اپنے مسائل ہیں اور اپنی اپنی زندگی۔سب اپنی اپنی لاش کو کاندھے پر اٹھائے ہوئے زندگی کا سفر کاٹ رہے ہیں۔بے حسی کا یہ عالم ہے کہ نہ خوشی میں شادماں ہوتے ہیں اور نہ غم میں غمگین انسان نما پتھروں پر کسی کیفیت کا اثر نہیں ہوتا۔

نہ صرف یہ بلکہ زماں و مکاں کی نئی تبدیلیوں کے ساتھ اس عہد کی تیز رو تر قیوں نے مستحکم عقائد کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تو شاعروں اور ادیبوں کے پاس ایسا کوئی عقیدہ نہ رہا جو اس کے پورے وجود کو کسی مقصد سے ہم کنار کر سکے اس لیے اسے کسی جماعت اور پیام سے دلچسپی نہ رہی۔اس نے فلسفہ سیاست مذہب اور اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔اور اپنے پہلوں کی طرح خدا، کائنات اور حیات کے تکون سمجھنے کے بجائے اپنی ذات کے عرفان کی کوششوں میں محو ہو گیا:

مل گئے سارے عقائد خاک میں
پانیوں میں بہہ گیا سورج مرا

(کمار پاشی)

کوئی پہچان ہی نہیں پاتا
کیا خدوخال ہو گئے میرے

(ظفر اقبال)

ہر ایک شخص کا چہرا اداس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے

(مظہر امام)

کیوں ستاروں کی طلب میں کھو دیا اپنا بھرم
کیوں میری مٹھی میں آتا آسماں میں کون ہوں

(مخمور سعیدی)

عجیب خوف ہے جذبوں کی اداسی کا
جواز پیش کروں کیا میں اس اداسی کا

(شہناز نبی)

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
ایک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا

(منیر نیازی)

جدید شاعروں کے نزدیک ان کے عہد کا انسان لاسمتی کا شکار ہے جو نہ تو صحیح راستے کا تعین کر پا رہا ہے اور نہ ہی اُسے اپنی منزل مقصود کا کچھ پتہ ہے وہ آسمان کی سیاہی اور زمین پر چھائے بے حسی اور لاتعلقی کے گہرے تجسس آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بدلتے موسموں کی رنگینی، شادابی اور قدرت کے دلکش مناظر سے بے زار ہو کر خلا کی وسعتوں میں کھو گیا ہے۔ اُس کے دل میں نہ کوئی تمنا ہے اور نہ کوئی آرزو۔ نہ اُسے کسی کا انتظار کرنے میں لطف آتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کے وعدے پر اعتبار کرتا ہے اُس کو اپنا جسم کھوکھلا نظر آتا ہے جس کی روح اس مشینی عہد کے شور وغل اور بے ہنگم ماحول میں کب کی اپنا مسکن چھوڑ چکی ہے۔ گویا جدید انسان کو روح کا شراپ ملا ہوا ہے کہ جس پر دعا، بددعا کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں یوسف حسین خاں لکھتے ہیں:

''جدید زمانے کا انسان آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی جس منزل میں ہے، وہاں وہ یہ سوچ رہا ہے کہ آیا زندگی اس قابل ہے بھی کہ زندہ رہا جائے، اس میں ایک عجیب جھنجھلاہٹ، الجھن اور بے زاری کی کیفیت پائی جاتی ہے، فرد اپنی شخصیت کھو چکا ہے، چاہے اس کا تعلق سرمایہ داری کے نظام سے ہو یا اشتراکی نظام سے، قدروں کا احترام اٹھ گیا، مگون، برہمی اور بے اعتباری کا ہر طرف دور دورہ ہے، جس کا اظہار خاص طور پر سیاست کے میدان میں ہو رہا ہے، دل عقیدت اور محبت سے خالی ہیں''[۳]

نفسیاتی الجھنوں اور دنیا سے لاتعلقی کا اظہار جدید غزل م میں کھل کر ہوا ہے جہاں ہمیں افراد کے ذہنی رویوں اور افسردگی و مایوسی کی ایک ایسی سنگین فضاد یکھنے کو ملتی ہے۔ جس کی مثال تاریخ ادب کے کسی دور میں بھی نہیں ملتی:

ایک طرف ٹوٹ پھوٹ جاری تھی
اک کہرام میرے اندر تھا

(ساقی فاروقی)

پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا

(سلطان اختر)

اس نئی تہذیب نے انسان کو جہاں بہت کچھ دیا ہے وہیں اس سے اس کا ماضی بھی چھین لیا ہے۔ نئے دور نے ہمیں کیا دیا، شہر کی بلند عمارتیں جن کے اندر انسانی حیات مرجھا گئی۔ گاؤں سے شہر کی طرف دوڑ جس نے فطری مناظر سے بے نیاز کر دیا۔ جدید نفسیاتی الجھنیں جس نے انسان سے اس کی ماضی کی یادوں کا سرمایہ چھین لیا۔ شب و روز کی مسلسل دوڑ دھوپ جس نے اس کے خط و خال سے جوانی کا رس نچوڑ لیا۔ زندگی کی تپتی دھوپ جس نے گھنیری شام کے فسوں سائے چھین لیے

شہروں کی بڑھتی آبادی جس نے صحن چمن خاک میں ملا دیا۔ چمکتے دمکتے ملبوسات جنہوں نے اس کی روح کو اور عریاں کر دیا۔ چیختی دھاڑتی مشینوں اور ملوں کی آوازیں جن میں بانسری کی سریلی مدھ بھری آواز میں ڈوب گئیں۔ مصلحت اندیش دوست جنہوں نے دوستی محبت اور خلوص کا خون کر دیا۔ آسمان کی بلندیاں جنہوں نے انسانوں کے قدموں سے اس کی زمین چھین لی۔ بازاروں کی چمک دمک جس نے اُسے بے ایمانی کا پیسہ کمانا سکھایا۔ بدلتے بگڑتے فلسفوں کی یلغار جس نے اسے بے عقیدہ انسان بنا دیا۔ مادہ پرستی جس نے ایک بے روح جسم کو جنم دیا۔ تفریح طبع کے وہ مصنوعی اسباب جس نے اسے مختلف ذہنی اور جسمانی امراض میں مبتلا کر دیا۔ سڑکوں پر دوڑتی پھرتی سواریاں جنہوں نے اسے معزور بنا ڈالا۔ چہروں پر نت نئے رنگوں کے چڑھتے اترتے گلاف جنہوں نے اسے عدم تحفظ کا شکار بنا دیا۔ سماج کا غیر مساویانہ سلوک جس نے اسے تنہائی کے کرب میں مبتلا کر دیا اور انجام کار نئے دور کی ان برکتوں کے انبار تلے انسان دب کر رہ گیا:

ہر ایک شخص کا چہرا داس لگتا ہے
یہ شہر میرا طبیعت شناس لگتا ہے
(مظہر امام)

اجنبی لوگ ہیں اور ایک سے گھر ہیں
کس سے پوچھیں کہ یہاں کون سا گھر اس کا ہے
(احمد مشتاق)

سب ملاقاتوں کا مقصد کاروباری زندگی
سب کی دہشت ایک جیسی، سب کی گھاتیں ایک جیسی
(منیر نیازی)

جدید اردو غزل میں اضطراب پیدا کرنے والے جنسی جذبات و تجربات اور اُن کی تسکین کے نفسیاتی پہلوؤں کا اظہار بھی نہایت خوبصورت اور سلیقہ مند

طریقے سے ہوا ہے۔اب غزل کا محبوب کوئی شجر ممنوعہ نہیں ہے کہ جس کو چھونے سے جنت سے نکل جانے کی سزا ملے اور نہ ہی وہ روایتی محبوب کی طرح پردہ نشین ہے کہ جس کی ایک جھلک دیکھنے کو عاشق بے تاب رہا کرتا تھا اور نہ ہی چلمن سے لگ کر بیٹھنے والا معاملہ ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں ۔جدید غزل کا محبوب نہ محل سراؤں میں رہتا ہے اور نہ شیش محلوں میں پل کر جوان ہوتا ہے کہ جو اپنے عاشق سے ملنے کے لیے دن رات سرد آہیں بھرا کرتا تھا بلکہ وہ تو اس نئے دور میں دفتروں، بازاروں، اسکولوں، کالجوں، ہوٹلوں،کلبوں غرض ہر جگہ اپنے عاشق کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے۔اب اُس کی محبت پر کسی طرح کا کوئی پہرہ نہیں ہے وہ جب چاہے جنس مخالف سے مل بھی سکتا ہے اور وصل کی جنسی لذتوں سے لطف اندوز ہوکر اپنی جنسی خواہشات کی تسکین بھی کرسکتا ہے:

دمک رہا تھا یوں توں پیراہن اس کا
ذرا سی لمس نے روشن کیا بدن اس کا
(باقی)

یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی وہ نظر تو آیا ہے
(امجد اسلام)

ریاکاری تہذیب کی سب سے بڑی قدر بن گئی ہے جس کا احترام ہر شخص کرتا ہے۔لوگ زناوں سے اعلی اقدار کی بات کرتے ہیں اور عمل میں اس کی نفی، یہ سیاست میں بھی ہوتا ہے، مذہب میں بھی، تعلیم وتدریس میں بھی، ادب وفلسفہ میں بھی اور عام سماجی زندگی میں بھی۔رجائیت کے ایسے پرستار جو انسانی اقدار کی بقا اور عوام کے دکھ درد کو سمجھنے کی بات کرتے ہیں، عمل اور زندگی میں اتنے ہی بے حس، بے رحم اور خودغرض نظر آتے ہیں جتنے وہ لوگ جو موجودہ روز جزا کے نام پر مظلوموں اور محنت کشوں کو اس زندگی میں قناعت اختیار کرنے اور دکھ کو مثبت قدر ماننے کا سبق

پڑھاتے ہیں۔جدید غزل ان دونوں کی ریاکاری کا نقاب چاک کرتا ہے اور انھیں ان کی اصلی شکل دکھاتا ہے:

اس فضا میں تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں
میں یہاں جرات پرواز بھلا کیا کرتا
(محسن احسان)

حواشی:۔

۱۔ علی احمد فاطمی، تنقید اور نئے اقدار، سرسوتی آفسیٹ پریس الہ آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۹

۲۔ ڈاکٹر سلیم زبیری، آزادی کے بعد پنجاب میں اردو غزل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۱ء ص ۱۲۸۔۱۲۹

۳۔ یوسف حسین خاں، اردو غزل، دارلمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

☆☆☆